بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنّما یخشی اللہَ مِنْ عبادِہِ العُلَمٰٓؤُا

ترجمہ: یقیناً اللہ تعالیٰ سے اُس کے بندوں میں سے علم والے ہی ڈرتے ہیں (القرآن)

مقامِ علم گھٹانے والے کے لئے تازیانۂ عبرت

رسالۂ مبارکہ

موازنۂ علم و کرامت

از رشحاتِ قلم

علّامہ پیر سیّد نصیر الدّین نصیرؔ گیلانی

سجادہ نشین آستانۂ عالیہ غوثیہ مہریہ گولڑہ شریف

﴾:عاجزانہ اپیل :﴿

میرے بچّوں کی صحت و تندرستی کے لئے دُعا فرمائیے . اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہر مصیبت اور پریشانی سے نجات عطا فرمائے. آمین

www.faiz-e-nisbat.weebly.com

موازنۂ علم وکرامت

علم کی اہمیت وفضیلت سے انکار ممکن نہیں۔ فضیلتِ علم پر بے شمار عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں جو مختلف ادوار میں اہل علم وتحقیق حضرات نے بصورتِ تصنیف وتالیف اربابِ فکر ونظر کے سامنے پیش کیے ہیں جن میں آیاتِ قرآنیہ احادیثِ نبویہ، فرموداتِ اکابرین امت اور نگارشاتِ دانشوران و طائفہ انسانی کی روشنی میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جس کا اعادہ یہاں ضروری نہیں، البتہ ایک انسانی فطری، اور نفسیاتی پہلو سے ہم یہ بات قارئین کے ذہن نشین کرانا مناسب سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جو بوجوہ خود تعلیم حاصل نہ کر سکا ہو اپنی اولاد کو ضرور تعلیم دلواتا ہے یا کم از کم دلوانا چاہتا ہے۔ چاہے اُسے سکول بھیج کر دلوائے یا کسی مدرسہ میں۔ اُس کا یہ عمل اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ علم کی اہمیت وفضیلت کو تسلیم کرتا ہے ورنہ اولاد کو تعلیم دلوانے کی کوشش کیوں کرتا؟ گویا ایک ان پڑھ اور جاہل انسان جو خود زیورِ تعلیم سے آراستہ نہیں وہ بھی در پردہ اپنی غفلت اور محرومی پر پشیمان ہے اس لئے اب وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی اولاد بھی جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وقت گزارے اور نورِ علم سے محرومی کی حالت میں زندگی کے سانس لے۔ علم کی فضیلت پر یہ ایک ناقابل تردید دلیل ہے جس کا ہم انسانی معاشرے میں آئے دن بچشمِ خود مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

لیکن بعض مقامات پر فضیلتِ علم کی نفی کے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل ایسا کام دکھائے تو باعثِ حیرت نہیں اس لیے کی وہ خود اس دولت سے محروم ہے، مگر جب ایک مدّعی علم جو معاشرے میں صاحبِ علم بھی کہلاتا ہو، ایسی حرکت کرتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریمؐ نے جس چیز کو باعثِ فضیلت قرار دیا، آخر ایک علم والا خود اُس کی تذلیل و

تحقیر کے در پے کیوں ہے؟ اس موضوع پر مختلف اہل علم حضرات سے بات چیت ہوئی، متعدّد صاحبانِ علم وفن کے سامنے یہ موضوع چلا، وجوہات پیش ہوئیں اسباب وعِلل سامنے آئے، آخر بڑی سوچ بچار اور اکابرِ اُمّت کی کتب کے مطالعہ سے اِس کی چند وجوہات سامنے آئیں اور ان وجوہات کا تعلق خالصتاً نفسیاتی دنیا سے ہے۔

یہ بات طے ہے کہ کوئی انسان اپنی تذلیل گوارہ نہیں کرتا، بلکہ اپنے لیے تعریف وتوصیف ہی پسند کرتا ہے جب تک وہ کسی معاملے میں دوسرے پر غالب یا کم از کم برابر رہتا ہے تو اسی وصف کو باعثِ عزّت سمجھتا ہے اور اس وصف یا فن کی خوبیاں بیان کرتا رہتا ہے، مگر جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس وصف یا فن میں کوئی اور مجھ پر غالب آرہا ہے اور میں مغلوب ہورہا ہوں یا اس وصف کے باعث معاشرے میں اُس کی عزت بڑھ رہی ہے اور میری عزت وشہرت زوال پذیر ہورہی ہے تو پھر وہ اسی علم یا فن کی لوگوں میں تنقیص شروع کردیتا ہے تاکہ وہ اپنی کم علمی یا اس فن کی محرومی کے عیب کو چھپا سکے۔ اس طرح وہ شخص جو اس سے علم وفن میں فائق وغالب ہے، اس کے متعلق لوگوں کو یہ باور کراتا ہے کہ جس علم یا فن میں فلاں شخص مہارت رکھتا ہے اس میں کوئی خاص فضیلت کی بات نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اسے طفل تسلّی بھی کہا جاسکتا ہے، گویا وہ یہ عمل کر کے اپنے اندر کے بچے کو تسلّیاں دیتا ہے تاکہ اس کا طفلِ دل مزید پریشانی کا شکار نہ ہو اور اُسے رات کو چین سے نیند آجایا کرے۔

امام غزالیؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف احیاء علوم الدّین میں حسد وکینہ حبِّ جاہ اور کبر وریا کے ابواب میں انسان کے اس نفسیاتی خلفشار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ گویا انسان صرف اپنی عزّت وشہرت ہی برداشت کرسکتا ہے، اپنے کسی ہم پیشہ کی فوقیت اور شہرت وکمال کا برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ ایسے عظیم لوگ جو ایسی قبیح ورذیل صفات سے مبرّا ہوتے ہیں ان کی تعداد ہر دور میں بہت ہی کم رہی ہے۔

اکابر محدّثین، فقہاء، مفسّرین، خطباء، شعراء اور دوسرے تمام علوم وفنون کے ماہرین تقریباً اسی صورتِ حال سے دوچار رہے اور اُن کو اپنے اپنے دور میں ایسے حاسدین ناقصین سے سابقہ رہا

ہے۔تاریخ کی اوراق گردانی سے بعض ایسے ایسے محیّر العقول واقعات سامنے آتے ہیں کہ انسان ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

ہم سَری اپنی کسی کو کب گوارا ہو سکی
دل ہی دل میں آدمی سے آدمی جلتا رہا

مولنا جلال الدّین رومیؒ اور مولنا عبدالرّحمٰن جامیؒ کی علمی، ادبی اور روحانی عظمتوں کا ایک زمانہ معترف ہے، مگراُن کے بعض معاصرین نے نہ صرف ان پر کڑی تنقید کی، بلکہ اُن کو عمر بھر تسلیم نہیں کیا اوراُن سے منسوب علوم وفنون کی توہین و تنقیص بھی کرتے رہے۔حالانکہ علوم وفنون کا اس میں کیا قصور تھا؟ بلکہ ان محسود شخصیات کی ان علوم وفنون میں مہارت ہی کے سبب حاسدین نے ان علوم و فنون کی افادیت واہمیت سے بھی انکار کردیا۔مولنا جلال الدّین رومیؒ کو شہر کے مفتیوں، خطیبوں اور برائے نام فقیہوں نے ہمیشہ نشانۂ ملامت بنائے رکھا۔ عارف رومیؒ کا قصور یہ تھا کہ جو کچھ وہ اپنی نگاہِ بینا اور مغزِ بیدار سے محسوس کرتے اور سمجھتے تھے، اُسے برملا لکھتے اور بیان کرتے تھے۔یہی حال مولنا جامیؒ کا تھا کہ اُنہیں اُن کی روشن خیالی اور بیدار مغزی کی وجہ سے سنگِ ملامت کا نشانہ بننا پڑا۔

اے روشنئِ طبع تو بر من بلا شُدی
ما را خراب کردی و خود مبتلا شدی

مگر تاریخ شاہد ہے کہ نہ وہ مفتی فتوے داغنے سے باز آئے اور نہ رومیؒ و جامیؒ نے اپنا چلن بدلا۔ اگر یہ حضرات بھی ماحول کے ہر اچھے بُرے سے اتفاق کرلیتے اور سب کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو شاید معاصرین ان سے یہ سلوک نہ کرتے مگر چونکہ وہ ذکیُ الطّبع، سلیم الفطرت، ذہین، جینیئس اور نابغۂ روزگار نفوس تھے اور معاصرین کی اکثریت ان کے علمی وفنی مقام سے بہت نیچے تھی اسی لیے انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے علمی وفنی کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ معاصرین کی ہرزہ سرائیوں اور یاوہ گوئیوں پر کان دھرنے کے بجائے ایسے ایسے علمی وادبی شاہکار

چھوڑے کہ قیامت تک آنے والی نسلیں اُن کی علمی عظمتوں کو سلام کرتی رہیں گی۔ بقول حافظِ شیرازؒ۔

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود

سال ہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

مولنا رومیؒ کی مثنوی جس کو ہر دور میں اربابِ فکر ونظر اور اصحابِ ذوق وعرفان نے اپنے لیے مُرشدِ راہ بنایا، کثیر تعداد میں شروحات لکھیں اور اِس مقولہ کو سچ جانتے مانتے ہوئے کہ...... ع ہست قرآں درزبانِ پہلوی...... صوفیائے کاملین نے اس کا درس باقاعدگی سے دیا اور بطورِ وظائف اپنے مطالعہ میں رکھا مگر اس کے بھی بعض مندرجات اور تمثیلات پر معاصرین کے علاوہ آج تک مخالفینِ تصوّف آئے دن ایک نہ ایک محاذ کھڑا کیے رکھتے ہیں اِسی طرح کلیاتِ جامیؒ میں غزلیات اور بعض رباعیات وقطعات پر اعتراض کیے جاتے ہیں مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی حضرتِ رومیؒ وجامیؒ کی علمی وادبی عظمتیں صرف اِس لیے مجروح نہیں ہوسکیں کہ اُنہوں نے اپنے خداداد ذہنِ رسا کی اُن بلندیوں پر جا کر کلام کیا تھا، جہاں تک کُند ذہن، کم عقل اور بے علم ناقدین وحاسدین پہنچنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ بقول مرزا بیدلؒ۔

سرِ بے نیازیِ فکر را بہ بلندیئے نرسانده ام

کہ بجز تتبعِ نظمِ من احدے خیالِ زمیں کند

قرآن مجید جو شریعت کی اوّلین اصل، تمام علوم کا ماٗخذ اور حقائق کائنات کا مصدر ومنبع ہے، جابجا فضیلتِ علم پر شاہد وناطق ہے۔ یہ امر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں حسنِ عمل یعنی اعمالِ صالحہ پر بھی زور دیا گیا اور ایمان کے ساتھ اکثر مقامات پر معطوف کر کے اعمالِ صالحہ کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا، مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ خود لفظِ ایمان مع تفصیل ومعانی کے علم کا مقتضی ہے چلو علم بقدرِ ضرورت ہی سہی، لیکن بغیر علم کے تو مفہوم ایمان کی بھی سمجھ نہیں آسکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کے لیے بھی علمِ شرعی ضروری ہے، بلکہ علم کے بغیر عمل ممکن ہی نہیں اور اگر ہے تو بھی بے سود ہے۔ چنانچہ

درج ذیل آیاتِ قرآنیہ اس بات کی تائید فرما رہی ہیں۔ قُل هَل یستوی الذین یعلمون والّذین لَا یعلمُون۔

ترجمہ: فرما دیجئے کہ کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور وہ جو علم نہیں رکھتے۔ وقولہٗ تعالیٰ وَمَا یعقلُها الاّ العٰلِمُون۔ ترجمہ: ان کو علم والوں کے بغیر کوئی نہیں سمجھتا۔ وقولہٗ تعالیٰ اِنّما یخشی اللّٰه مِن عِبادہ العُلَماء۔ ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرتے ہیں وقولہٗ تعالیٰ یرفع الله الّذین اٰمنوا منکم والّذین اُوتوا العِلمَ دَرَ جٰتٍ۔ ترجمہ: بلند کر دے گا اللہ ان لوگوں کو کہ ایمان لائے ہیں تم میں سے اور ان لوگوں کو کہ دیے گئے ہیں علم، کئی درجے وقولہٗ تعالیٰ شهدالله انّهٗ لَا اِلٰهَ اِلّا هُوَوَالملٰئکۃُ وَ اُو لُو العلمِ قائماًبالقسطِ۔

ترجمہ: گواہی دی اللہ تعالیٰ نے کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ اور گواہی دی فرشتوں نے اور اربابِ علم نے حال یہ کہ اللہ قائم ہے ساتھ انصاف کے۔ بطورِ نمونہ یہ چند آیات درج کی گئی ہیں ورنہ قرآنِ مجید میں بیسیوں آیات اِس موضوع پر موجود ہیں۔

دوسرے اصلِ شرع یعنی سنت وحدیثِ نبویؐ میں بھی فضیلت و اہمیتِ علم پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے انّی علیم اُحبّ کلّ علیم یعنی میں علم والا ہوں اور ہر صاحبِ علم کو دوست رکھتا ہوں۔ ارشادِ نبویؐ ہے فضل العالِم علی العابد کفضلی علیٰ ادناکم ترجمہ: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری تم میں سب سے ادنیٰ پر۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد میں دو مجلس، مجلس اہلِ ذکر و مجلس تعلیم و تعلّم کے ملاحظہ فرمانے کے بعد ہر دو مجالس کے اہل پر خوشنودی ظاہر فرمائی اور سلسلۂ تعلیم والے گروہ کو ذاکرین پر ترجیح دی اور فرمایا کہ اِنّما بُعِثتُ مُعلِماً میں بہ حیثیت و منصبِ معلّمی مبعوث ہوا ہوں۔ اس طرح گروہِ اہلِ علم کو اپنے ساتھ شرفِ شمولیت بخشا اور اُن کے پاس جلوس فرمایا نیز متعدد اقوالِ صلحاء وارشاداتِ صحابۂ عُظام بھی اس موضوع پر موجود ہیں مگر باوجود ان تمام قطعی دلائل اور براہین و

نُجّ کے بعض جہلاء کا خیال ہے کہ کرامت کا مقام علم سے زیادہ ہوتا ہے اُن کو اتنا علم نہیں کہ دراصل علم ہی منبع کرامات ہے۔ علم خود ایک اتنی بڑی کرامت ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی دوسری کرامت کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کیونکہ کرامت، تکریم اور اکرام کے معنٰی عزت و مرتبہ والا ہونا یا کسی کی عزت واحترام کرنا ہے اور مندرجہ بالا آیات واحادیث سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا ہے کہ عزت و کرامت عند اللہ وعند الرّسول ﷺ علم والوں ہی کی ہے۔ ہم آگے چل کر کرامت کے معنٰی ومفہوم اور اس کی شرعی حیثیت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں لیکن لگے ہاتھوں یہ بھی ذہن نشین کرائے دیتے ہیں کہ قرآن مجید کی جس آیتِ مقدّسہ کو اثباتِ کرامت کے لیے پیش کیا جاتا ہے وہ کرامتِ علم واہلِ علم ہی ہے۔ وقالَ الّذی عندہٗ علم " من الکتٰب کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جس شخص نے دربارِ سلیمانیؑ میں آنکھ جھپکنے سے پہلے تختِ بلقیس لانے کا دعوٰی کیا تھا اس کے پاس بھی کتاب کا کچھ علم تھا یعنی اُس کی اِس کرامت کے صدور کا باعث بھی علمِ کتاب ہی تھا ورنہ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرما سکتا تھا کہ ایک شخص نے آنکھ جھپکنے کے عرصہ میں تخت لے آنے کا دعوٰی کیا اور اس کے وصفِ علم کا ذکر نہ فرماتا۔ تب یہ کہا جا سکتا تھا کہ سلیمان علیہ السّلام کی موجودگی میں جس شخص نے تخت لانے کا کہا وہ صرف ایک مادر زاد ولی تھا، جیسا کہ آج کل کے بعض جاہل، علم کو ولایت کی شرط قرار نہ دیتے ہوئے ایک اَن پڑھ آدمی کو بھی مادر زاد ولی کہہ دیا کرتے ہیں، مگر یہ فلسفہ خانہ زاد اور سراسر غلط ہے اور یہ لوگوں کو محض بے وقوف بنانے والی بات ہے کہ ایک بے علم آدمی کو لوگوں کی توجہ اور عقیدت کا مرکز بنانے کے لیے مادر زاد ولی کی خود ساختہ اصطلاح سے حُرمتِ لفظ مجروح کی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اِس کا فیصلہ فرما دیا کہ سلیمان علیہ السّلام کے سامنے جس شخص نے تخت لانے کے لیے اپنی خدمت پیش کی تھی وہ ایک عالمِ کتاب تھا کوئی اَن پڑھ محض مادر زاد ولی کہلوانے والا نہ تھا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ کرامات کے صدور وظہور کے لیے صاحبِ علم ہونا بھی ضروری ہے نیز یہ امر بھی اصحابِ تحقیق پر مخفی نہیں کہ دربارِ سلیمان علیہ السلام میں تختِ بلقیس لانے والے شخص کے متعلق مشہور قول ہے کہ وہ آپؑ کا وزیر آصف بن برخیا تھا یہ حتمی اور قطعی قول نہیں ہے، بلکہ کتبِ معتبرہ میں

دیگراقوال بھی ہیں۔ چنانچہ شرح عقائد کی عبارت کـأتیـان صاحب سلیمان علیه السلام وھوَ آصف بن برخیا علَی الاشھر بعرشِ بلقیس قبل ارتدادالطّرف مع بُعدالمسافة اس عبارت کے حاشیہ میں ہے۔ قولهٗ وھُوَ آصف بن برخیا الخ وزیر سلیمان وقیل کاتبهٗ وکان صدّیقاً عالماً اسمهٗ اسطوم وانّما قال علی الاشھر لانّهٗ قیل انهٗ الخضر علیه السّلام وقیل جبرئیلؑ او ملك ایّده اللّٰه تعالیٰ بهٖ وقیل سلیمان نفسه ۱۲ کستلی۔ نیز اس کے حاشیہ پر مولانا برخوردار ملتانیؒ یہی تحریر کرتے ہیں۔

ھو وزیرُ سلیمنؑ وقیل کان صدّیقاً عالماً واسمهٗ اسطوم وانّما قال علی الاشھر لانّهٗ قیل الخضر و قیل سلیمان نفسه و کان آصف من بنی اسرائیل۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔ آصف بن برخیا وزیرهٗ او الخضر او جبریل و ملك ایّده اللّٰه بهٖ او سلیمان نفسهٗ۔ فیکون التعبیر عنه بذٰلكَ للدلالة علیٰ شرف العلمِ وانّ ھذهِ الکرامة کانت بسببهٖ الخ

تفسیر روح المعانی میں ہے۔ واختلف فی تعیین ھذا القائل فالجمھورو منھم ابن عباس و یزید بن رومان واحسن علیٰ انهٗ آصف بن بر خیا بن شمعیا.... کان وزر سلیمان علیٰ المشھورِ، و فی مجمع البیان أنهٗ وزیرهٗ وابن أ ختهٖ و کان صدیقاً یعلمُ الاسم الاعظم و قیل کان کاتبهٗ وَ آخرج ابن ابی حاتم عن مجاھدٍ أنهٗ رجل اسمهٗ اسطوم و قیل اسطورس ...... وَ أ خرج ھو ایضاً عن ابن لھیعة انه الخضر علیه السّلام .... و قال النخعی ھُوجبریل علیه السّلام و قیل ھو ملك آخر ایّد اللّٰه تعالیٰ بهٖ سلیمان علیه السلام و قال الجبائی ھُوَ سلیمان نفسه علیه السّلام۔

تقریباً یہی اقوال تفسیرِ کبیر للامام فخر الدّین رازیؒ میں بھی موجود ہیں۔

مفاد اِن مذکورہ بالا عبارات کے نقل کرنے کا یہی ہے کہ مجلسِ سلیمانیہ میں وہ حاضر شخص جو بھی تھا عالمِ کتاب تھا کیونکہ لفظ صدیقاً عالماً صراحت کر رہا ہے تو ہمارا موقف واضح ہو گیا۔ صدورِ کرامت کسی صاحبِ علم سے ہی ہوتا ہے اور علامہ بیضاویؒ نے تو صراحۃً فرما دیا کہ یہ بات شرفِ علم کے اظہار کے لیے تھی اور امام غزالیؒ نے بھی اپنی کتاب حقیقۃ العلم کے پہلے باب میں یہی فرمایا کہ ''اِس میں اِس بات کی تنبیہ ہے کہ وہ علم کے زور پر تخت لانے پر قادر ہوا'' اگر کچھ دیر کے لیے ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ علم کے بغیر بھی کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ کرامت کے ظہور کے لیے مرّوجہ اصلاحاتِ تصوّف کے مطابق غوث، قطب یا ابدال ہونا بھی ضروری ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس سے کرامت ظاہر ہوگی وہ ضرور غوث، قطب یا کم از کم ولی ہوگا۔ مگر مقامِ تعجب ہے کہ تصوّف کے ایک بہت بڑے شیخ نے اِس بات کا بھی فیصلہ کر دیا جن کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مادرزاد ولی تھے۔ مگر انہوں نے کسی بھی جگہ اپنی ولایت وقطبیت کا سبب محض بطنِ مادر سے اپنے ولی پیدا ہونے کو قرار نہیں دیا، بلکہ صاف الفاظ میں اپنی قطبیت کا واحد سبب حصولِ علم کو قرار دیتے ہوئے فرمایا......رع

درستُ العِلمَ حتّٰی صرتُ قطباً

یعنی میں نے اتنا پڑھا کہ پڑھتے پڑھتے قطبِ وقت بن گیا اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اِس مصرع میں حضرت پیرانِ پیرؒ نے صرف حصولِ علم پر زور دیا یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اتنا عمل کیا کہ عمل کرتے کرتے قطبِ وقت بن گیا، حالانکہ اُن کی ساری زندگی علم وعمل کا حسین امتزاج رہی مگر یہاں صرف علم کی اہمیّت کو اُجاگر کرنا مقصود تھا۔

حضرت پیرانِ پیرؒ سے عقیدت کا دعوٰی رکھنے اور اُن کے نام پر کھانے اور عزّت پانے والے یہ بتائیں کہ کیا علم کے بغیر کوئی شخص قطب یا مادرزاد ولی بن سکتا ہے؟ اگر پیرانِ پیرؒ جیسا جگت شیخ عرصۂ دراز تک علم حاصل کرتے کرتے کہیں جا کر قطبِ وقت بنتا ہے تو اُس سے بڑھ کر ایسا کون نابغۂ روزگار اور مافوق الفطرت انسان اِس بات کا دعوٰی کر سکتا ہے یا کوئی کسی کے لیے یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص علم کے بغیر قطبِ وقت یا مادرزاد ولی تھا، یا ہے۔ یا تو پیرانِ پیرؒ کے اس مندرجہ بالا مصرع

شعر کو قصیدۂ غوثیہ سے یہ کہہ کر خارج کرنا پڑے گا کہ یہ الحاقی شعر ہے یا حضرت صاحبؒ عالمِ سُکر میں ایسا کہہ گئے یا پھر اُن کی بیان کردہ اس حقیقت کو بہ طورِ عقیدہ تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ جب دوسرے بہت سے معاملات میں بزرگوں کے اقوال و اشعار کو عقیدے کے درجہ پر رکھا جاتا ہے تو اُن کے بعض خلافِ طبیعت اشعار و اقوال کو تسلیم کرنے میں تأمّل سے کام کیوں لیا جاتا ہے کیا یہ دوہرا رویّہ اور دورُخا طرزِ عمل حسنِ عقیدت کہلائے گا یا منافقت؟

قارئینِ گرامی کو بہ طورِ یاددہانی بتاتا چلوں کہ حضرتِ پیرانِ پیرؒ کے اُن تمام مناجاتی اشعار اور وظائف و اوراد میں موجود کلمات اور مواعظ و ارشادات میں مرقوم الفاظ کو یہ نام نہاد غلامانِ غوث پاکؒ لائقِ توجہ اور قابلِ التفات ہی نہیں سمجھتے، جن میں خالص توحید کا درس دیا گیا ہے اور ہمہ قسمی ذاتی وصفاتی شرک کی زبردست نفی کی گئی ہے یا جن سے پیرانِ پیرؒ کا ذوقِ توحید پرستی آشکار ہوتا ہے اور اُن کا ایک سچّا اور پکا مومن موحدّ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید کے لیے آپؒ کی تصانیف فتح الرّبانی، فتوح الغیب وغیرہ موجود ہیں اور بہجۃ الاسرار میں آپ کے فرامین و ارشادات بھی اس پر شاہد و ناطق ہیں۔

یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پیرانِ پیرؒ مادرزاد ولی تھے تو اُنہوں نے حصولِ علم کی خاطر بجِستیر (ایران) سے بغداد تک کا طویل تر سفر کیوں اختیار فرمایا تھا۔ اگر وہ پیدائشی ولی ہوں تو معاذ اللہ ہمیں اِس بات پر ذرّہ بھر بھی اعتراض نہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حصولِ علم کا مقصد قربِ خداوندی ہوتا ہے اور قربِ خداوندی کو ہی ولایت کہتے ہیں کیوں کہ ولی کا معنیٰ دوست کے ہیں اور دوست وہی ہوتا ہے جسے قرب بھی حاصل ہو۔ عدمِ قرب عدمِ ولایت پر دال ہوتا ہے اور حصولِ قرب وجودِ ولایت (دوستی) پر دلالت کرتا ہے جب پیدائشی طور پر آپؒ کو وہ منزل (منزلِ ولایت) مل گئی تو پھر اُس چیز کے تحصیل کی کیا ضرورت تھی یا یہ کی وہ اُس چیز (علم) کو حاصل کرنے کی خاطر کیوں عمر بھر کوشاں رہے جس کے حصول کا منشا قربِ خداوندی ہوتا ہے؟ اصطلاحِ صوفیاء میں قربِ خداوندی ہی کو ولایت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو جب پیدائشی طور پر انہیں منزلِ ولایت یعنی قربِ

خداوندی حاصل ہی تھا تو پھر تحصیلِ علم کے لیے مختلف صعوبتیں اور تکلیفیں اُٹھانے کا کیا مقصد تھا؟ ایک حاصل شدہ چیز کو دوبارہ حاصل کرنا تحصیل حاصل نہیں تو اور کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت پیرانِ پیرؒ کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں پیدائشی طور پر استعدادِ قرب اور جوہرِ کمال رکھا گیا تھا اور ان کا قلبِ اطہر ازل سے انوارِ ذات کا مرکز بننے کی صلاحیت لے کر بشری قالب میں ڈھلا تھا اگر یہ مفہوم لیا جائے تو بشمول حضرت پیرانِ پیرؒ کے کئی دوسری شخصیات پر بھی مادر زاد ولی کے اطلاق کو درست مانا جاسکتا ہے، بصورتِ دیگر وہی اعتراضات وارد ہوں گے جن کا اوپر تذکرہ کردیا گیا۔

اسی طرح آج کے کم علم لوگ یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ حضرت پیر مہر علی شاہؒ علم کی وجہ سے مرزا قادیانی کے مقابلے میں نہیں نکلے بلکہ کرامت کے زور پر سامنے آئے تھے۔ یہ فلسفہ بھی سراسر جہالت اور بے علمی پر مبنی ہے اور یہ بات کہنے والے لفظِ کرامت کا صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کر پاتے بلکہ کاف کو مکسور پڑھتے ہوئے کِرامت کہتے ہیں حالانکہ عربی اور فارسی کی متعدد لُغات میں یہ لفظ مفتوح الکاف یعنی کَرامت ہی آتا ہے۔ اس مذکورہ بالا خود ساختہ فلسفہ کا جواب ملاحظہ ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علم بذاتِ خود ایک بہت بڑی کرامت ہے، کیونکہ لفظِ کرامت کے مفہوم و معنٰی بھی اختصاص، امتیاز اور فضیلت کے ہیں۔ میرے پاس اِس پر منصوص دلیل حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا وہ ارشاد ہے جسے قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: اس آیت میں کہا گیا کہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور پھر ان ہر دو حضرات نے اس (ولقد اٰتینا داوٗد و سلیمٰن علماً و قالا الحمد لله الذی فضّلنا علیٰ کثیر من عباده المؤمنین) عطا کردہ علم کو اپنے لیے وجہِ فضیلت و کرامت فرمایا نہ کہ اپنے کسی معجزہ کو۔ حالانکہ انہی حضرات سے معجزات کا صدور بھی ہوا مگر انہوں نے قابلِ ذکر چیز اپنے کسی معجزہ کو نہ سمجھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم کو اپنے لیے وجہِ کرامت و امتیاز گردانا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ کسی بھی خرقِ عادت کام کا صدور معجزہ کی صورت میں ہو یا کسی غیرِ نبی سے کرامت کی شکل میں ہو علم دونوں کے لیے قدرِ مشترک اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ آیتِ محولہ بالا میں فضّلنا اور کرّمنا کے معنٰی ایک ہی ہوئے یعنی تفضیل اور

تکریم کے الفاظ واحد المعنیٰ ٹھہرے ۔ لہٰذا میرا یہ کہنا کہ علم بذاتِ خود سب سے بڑی فضیلت اور کرامت ہے بحو الہ بالا آیت قرآنیہ کی رو سے بلکل صحیح ٹھرا۔ نیز شرح عقائد کے حاشیے پر ہے:

اعلم انّ الکَرامةاسم من التکریم والاِکرام و جمعها الکرامات وهو الفعل خارق للعادة غیر مقرون بالتحدی وقد اعترف بها اهل السنة ۔گویا کرامت کا مفہوم یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرب وصالح بندہ جب اپنا ہر کام رضائے الٰہی کے لیے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی ایک عزّت ہوتی ہے لہٰذا جب کبھی وہ کسی موقع پر اپنی زبان سے ایسی بات نکال بیٹھے جو عادتاً مشکل نظر آتی ہو تو اللہ تعالیٰ ان کی عزّت کی لاج رکھتے ہوئے اُس بات کو سچا ثابت کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں اُس صالح مردِ خدا کا سر شُکر سے جھک جاتا ہے اور وہ بارگاہِ مولیٰ میں سر بسجو د ہو کر بزبانِ پیر مہر علی شاہؒ یوں عرض کرتا ہے۔

توئی کہ ذرّہ صفت را بہ آسماں بُردی

چہ گونہ شکرِ تو گوید کمینہ ، بندہ نواز!

نہ یہ کہ وہ اِس پر اکڑتا ہے اور نہ ڈینگیں مارتے ہوئے اِس خارقِ عادت فعل کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ جب کرامت کا مفہوم ہی وہ عزّت وتکریم ہے جو اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کے ہاں بندے کو حاصل ہوتی ہے تو دلائل قطعیہ (آیات واحادیث) کی روشنی میں سب سے بڑی عزّت بندوں کے لیے اللہ کے ہاں علم والی ہے، جیسا کہ ابھی کچھ پہلے بیان ہوا ہے۔ مزید یہ کہ یرفع الله الّذین اٰ مَنُوا منکم والّذین اُوتو االعلمَ درجٰت ، اور خیارُ اُمّتی علماء ها و خیا رُ علماءِ هَا فقهاؤها کے اعتبار سے بھی کرامتِ اعلیٰ علم ہی کو حاصل ہے، باقی سب چیزوں کو بعد میں اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیّت اِسی کرامتِ علمی کو حاصل ہے چنانچہ آپکے سوانح حیات ''مہرِ منیر'' کے صفحہ 577 پر مندرج یہ عنوان اور اسکے تحت مندرج چند سطور ملاحظہ ہوں

علومِ لدنّیہ کی کرامتِ عظیمہ

''حضرتؒ کی دوسری عظیم الشان کرامت آپ کے علمِ بیکراں کی وہ خداداد دولت تھی، جو ہمہ وقت جلو میں دست بستہ حاضر رہتی کہ جس طرح چاہتے تصرّف میں لے آتے جس کے دُرہائے آبدار تصنیفات اور ملفوظات میں بکھرے نظر آتے ہیں''۔ ان سطور پر غور فرمائیں کہ علم حضرت گولڑویؒ کی کرامتِ عظیمہ ہے اور شاید کوئی کج فہم یہ کہے کہ لفظ ''دوسری'' سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے نمبر کی کرامت کوئی اور ہے اور شاید کرامتِ حسّی ہو ہرگز نہیں بلکہ یہ پہلا اور دوسرا نمبر مؤلف ''مہرِ منیر'' نے افہاماً یعنی سمجھانے کے لیے دیا ہے یعنی یہ ترتیب استفہامی ہے ترتیب حقیقی اور ترتیبِ رُتبی نہیں۔

مرزائے قادیانی کے مقابلے میں بھی آپ کی اِسی کرامتِ عظیمہ کا اظہار ہوا تھا اور ہوا ہی نہیں تھا بلکہ کرایا گیا تھا۔ چنانچہ ''مہرِ منیر'' کے صفحہ 203 پر مندرج یہ پیرا خصوصی توجہ سے پڑھیں۔

ملفوظاتِ طیّبات میں درج ہے کہ حضرت قبلہ عالم قدّس سرّہٗ نے فرمایا کہ عالمِ رؤیا میں آنحضرت ﷺ نے مجھے مرزائے قادیانی کی تردید کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''یہ شخص میری احادیث کو تاویل کی قینچی سے کتر رہا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو''۔

اس اقتباس کو بغور پڑھنے سے یہ حقیقت مترشّح ہوتی ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے حضرتِ گولڑویؒ کو حکم دیتے ہوئے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ آپؒ کی ذات میں موجود وصفِ علم کی بنیاد پر ہی تھے کیونکہ جو شخص علمِ حدیث میں مہارتِ تامّہ نہ رکھتا ہو وہ کسی ایسے بے دین کو لگام کب دے سکتا ہے جو احادیثِ شریفہ کو تاویلات کی قینچی سے کتر رہا ہو۔ تاویلاتِ فاسدہ کا ردِّ بلیغ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص خود بھی علمِ حدیث شریف میں ماہر ہو، احادیث کے متن اور سند پر عمیق نظر رکھتا ہو، اسماء الرجال اور فنِ جرح وتعدیل پر بھی عبور رکھتا ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ ردِّ قادیانیت کے لیے آپ کو علم کی کرامتِ عظیمہ کے سبب ہی مأمور کیا گیا تھا، ورنہ دربارِ رسالت مآب ﷺ سے یہ حکم

اُس وقت کے کسی زاہدِ محض یا خشک اور اَن پڑھ صوفی پیر کو بھی دیا جا سکتا تھا۔ ذرا سوچیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب اس عظیم خدمت کیلیے آپ کو منتخب ہی وصفِ علم کے سبب کیا گیا، اُسی کی نفی کر کے کہا جائے نہیں نہیں علم کی وجہ سے آپ کو یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی تھی بلکہ محض صاحبِ کرامت بزرگ ہونے کی وجہ سے یہ کام آپ سے لیا گیا۔ یا یہ کہ آپ ایک مادرزاد ولی تھے اور اس فتنہ عظیمہ کی سرکوبی کے لیے ایک مادر زاد ولی کا ہونا ضروری تھا۔ قارئین! حضرت پیر صاحب گولڑویؒ کے مادرزاد ولی ہونے کا ہم انکار نہیں کرتے، لیکن محض خوش عقیدگی کی رَو میں بہہ کر حقائق سے آنکھیں چرانا بھی کوئی مناسب بات نہیں؛ جب آپؒ مادرزاد ولی تھے تو ایک ولی کے لیے ولی ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ اُس کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہ ضَرَبَ یضرِبُ کی گردانیں یاد کرنے میں ضیاعِ وقت کرے اور اُستادوں کے جوتے اُٹھاتا پھرے گھر بار چھوڑے، عیش و آرام کو خیر باد کہہ کر گاؤں کے محلّوں اور گلیوں میں جا جا کر ٹکڑے مانگے اور دوسرے عام طلبہ کی طرح زنبیلِ گدائی لے کر ہر ایرے غیرے کے دروازے پر صدائیں لگاتا پھرے۔ مگر یہ سب نہ صرف حضرت گولڑویؒ نے کیا بلکہ ہمارے اکابرِ امّت انہی صبر آزما مراحل سے گزرے اور اِسے اپنے لیے اعزاز تصوّر کیا۔ کیونکہ اُس وقت آج کی معاشی وسعتوں کا نام و نشان تک نہ تھا معلوم ہوا کہ حضرت گولڑویؒ کے والدِ ماجد بھی یہ سمجھتے تھے کہ محض کسی عالی گھرانے میں پیدا ہو جانے سے انسانی عظمتوں کی بلندیوں کو نہیں چھُوا جا سکتا بلکہ بقولِ شیخ سعدیؒ۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

کے تحت مہر شاہ کو پیر مہر علی بننے تک کے مراحل علم ہی کے ذریعے طے کرنا ہوں گے چنانچہ اپنے اِس ذہین فرزند کو حصولِ علم کے لیے دُور دراز شہروں میں بھیجا اور راہِ دین میں اپنے اِس لختِ جگر کی جدائی کو بہ سر و چشم قبول کیا۔ اگر محض نماز، روزہ اور اوراد و وظائف خوانی ہی سے مرزائیت جیسے

www.faiz-e-nisbat.weebly.com

صبر آزما معرکے سر ہو سکتے تو اُس وقت موجود حضرت گولڑویؒ کے بعض بزرگ افرادِ خانوادہ بھی سر کر لیتے۔ مگر سب نے دیکھا کہ یہ کام پیر سیّد نذرالدین گیلانیؒ کا صرف ایک بیٹا ہی سرانجام دے سکا اور وہ بھی توفیق الٰہی اور اپنے خداداد علم وصلاحیت کے بل بوتے پر۔

حضرت گولڑویؒ نے جو مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے علم حاصل کیا اور پھر علم وفضل کی جن بلندیوں تک پہنچے وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔ یہ محض کرامت ہی نہ تھی بلکہ بقولِ راقم الحروف ؎

آسماں سے کوئی پوچھے یہ تنگ تابِ ہلال
کن مراحل سے گزرتا ہے قمر ہونے تک

مادرزاد ولایت کا جو مفہوم ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اُس اعتبار سے وہ ایک ایسے جوہرِ قابل کے مالک تھے کہ تائید ایزدی بچپن ہی سے اُن کے ساتھ رہی۔ اِس قسم کی مثالیں اُمت کے دیگر اکابر کے ہاں بھی ملتی ہیں مگر یہ کہنا کہ کسی جوہرِ قابل کو علومِ ظاہری کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، یہ سراسر غلط ہے۔ میرے دادا حضرت بابوجیؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے صرف اس بات پر ناز ہے کہ میرے والدِ ماجدؒ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے اور اُن کے دَور میں علوم وفنون کے اعتبار سے اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ حضرت بابوجیؒ کو میں نے کبھی یہ کہتے نہیں سنا کہ میرے والدِ ماجدؒ کرامات میں بے مثل تھے یا یہ کہ وہ ایک مادرزاد ولی یا عالی نصب سیّد تھے۔ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں کرامات و ولایت کے جوہر بھی رکھے تھے اور وہ زہد وتقویٰ اور تزکیۂ نفس جیسی صبر آزما تربیت گاہوں سے گزر کر انسانیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے مگر جس چیز نے اُنہیں اِن مراتبِ اعلیٰ پر فائز کیا وہ صرف علمِ شریعت اور پھر اُس پر عمل تھا جو اہلِ فضل کے نزدیک ہر کمال تک پہنچنے کا زینہ ہے۔ محض کراماتِ معروفہ کا صدور تو مجاذیب سے بھی ہو سکتا ہے بلکہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔ مگر دنیائے تصوّف میں ایسے لوگ رشد وہدایت کے قابل نہیں ہوا کرتے اور نہ اُن کا کوئی قول وفعل نمونہ وحجت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے بے شمار مجذوبوں اور ننگے فقیروں کے حالات میں پڑھا ہے کہ ان کے ہاتھ پر

بعض ایسی ایسی کراماتِ معروفہ فی العوام کا صدور ہوا کہ انسانی عقل حیرت میں پڑ گئی کہ بظاہر اُن کی تعلیم کچھ بھی نہیں ہوتی مگر جو کہہ دیتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے۔ بااِیں ہمہ ایسے مجاذیب کو اہلِ طریقت اُن ذی علم مشائخ کا درجہ کبھی نہیں دیتے، جو جامع معقول ومنقول ہونے کے ساتھ ساتھ دنیائے شریعت وطریقت میں حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت بابوجیؒ ''مہرِ منیر'' میں حضرت گولڑویؒ سے منسوب کرامات کا باب حذف کردینے کا اصرار کرتے رہے۔ مگر آج کے بعض ذہن چونکہ علم سے بہت دُور ہیں اس لیے وہ ایسے قصوں اور کہانیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسے انسان کے باکمال ہونے کا معیار تصوّر کرتے ہیں۔ اکابر اولیاء کی تصانیف میں کرامات کو ایک عام عمل قرار دیا گیا اور اِسے اثباتِ ولایت کے لیے دلیلِ محض نہیں کہا گیا بلکہ بعض اولیاء سے جب کرامت کا صدور ہوتا تھا تو وہ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں اس میں ہمارے لیے کوئی آفت نہ ہو کیونکہ بعض اوقات بطورِ مکرِ الٰہی بھی ایسا کر دیا جاتا ہے کہ بندہ گناہ کر رہا ہوتا ہے مگر اُس کے ہاتھ پر خوارق وکرامات کا ظہور ہو رہا ہوتا ہے۔ تاکہ یہ اِسی مہلت اور ڈھیل میں خوش ہو کر مزید گمراہیوں کی دلدل میں دھنستا چلا جائے۔ اِسی بات کو فاضلِ اجل ہمام اکمل فرید العصر وحید الدھر السید الشریف علی بن محمد الجرجانیؒ نے ''کتاب التعریفات'' میں یوں بیان فرمایا ہے۔

(المکر) من جانب الحقّ تعالٰی ھو ارداف النّعم مع المخالفة وابقاء الحال مع سوء الادب واظھار الکرامات من غیرِ جھدٍ (الخ) یعنی باوجود مخالفتِ احکامِ الٰہیہ کے مسلسل نعمتوں کا ملنا سوءِ ادب کے باوجود حال وکیفیّت کا برقرار رہنا اور بغیر جُہد وکوشش، محنت وسعی عمل کے بھی خوارق وکرامات کا ظہور، یہ بندے کے حق میں ایک مکر (خفیہ تدبیر) بھی ہوسکتی ہے اور شاید اسی کو استدراج بھی کہتے ہیں جس کے معنٰی ''اندک اندک نزدیک کردن بعذاب'' کے ہیں یعنی بے ایمان اور بے عمل بندے کو خوارق کے ظہور کے نشے میں مست کر کے تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ عذاب کے قریب کر دیا جائے، یہاں تک کہ اُس کے لیے واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو جائے اور وہ واللّٰہ خیرُ المٰکرین کے مفہوم کا مزا چکھ لے۔

آپ کو تصوّف کی معتبر ترین کتب میں یہ مقولہ ملے گا الاستقامة فوق الکرامة شریعتِ مطہرہ پر استقامت، کرامت سے کہیں برتر و بالا ہے۔ کسی بزرگ کی ولایت کو پرکھنے یا اُس کا مقام و مرتبہ متعیّن کرنے کے لیے اُس سے کثیر کرامات کا صدور کوئی ایسا پیمانہ نہیں جسے کتبِ تصوّف میں معیارِ فضیلت و ولایت بنایا گیا ہو، بلکہ علمِ شریعت میں مہارت، عمل و کردار میں استقامت اور خدماتِ دینیہ کو معیار قرار دیا گیا، جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں جو مقام و مرتبہ اور فضیلت وافضیلت رکھی گئی ہے وہ کثرتِ معجزات کے سبب نہیں بلکہ وہ کوئی اور چیز ہے۔ اِسی لیے افضل الانبیاء سیّد الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے اس قدر معجزات کا ظہور نہیں ہوا جتنا دیگر انبیاء علیہم السّلام سے ہوا، حالانکہ آپؐ کی فضیلت تمام انبیائے کرام پر مسلّمہ ہے امام شرف الدّین بوصیریؒ قصیدہ بُردہ شریف میں یہی حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں۔

لو ناسبَت قدرہٗ اٰیاتہٗ عِظماً

أحیی اسمُہٗ حِین یُد عیٰ دَارِسَ الرِّمَمِ

اگر آپؐ کے مقام و مرتبۂ حقیقی کی مناسبت سے آپ کی ذاتِ گرامی سے معجزات و خوارق کا ظہور/صدور ہوتا تو فقط آپ کا نامِ پاک لینے ہی سے مُردہ اور بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جاتیں لیکن اُن کے متبادل آپ کو ایسا دائمی، ابدی، اکمل اور آفاقی معجزہ عطا کیا گیا جس کی مثال کہیں کسی نبی کے پاس نہیں ملتی اور وہ قرآنِ مجید ہے۔ قرآن شریف حقائق و معارف اور علوم و حِکَم کا خزانہ ہے اِس میں صرف خوارق و کرامات کے نسخے نہیں، بلکہ یہ رہتی دنیا تک ایک نسخۂ کیمیا ہے۔

دیکھیں صحابہؓ اور اہلِ بیتؓ سے زیادہ کون ولی ہو سکتا ہے مگر آپ اُن کے حالات پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ اُن کی استقامت ہی استقامت نظر آئے گی۔ کرامت کا وہ مفہوم جو بعد والوں میں رائج ہوا صحابہؓ اور اہلِ بیتؓ کے ہاں وہ آپ کو کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔ انہوں نے شریعت کے احکام پر کار

بندی اور استقامت ہی کو اپنا مقصدِ حیات جانا، اِس لیے کہ اُن کو یہی تعلیم خود قرآنِ مجید نے اِن الفاظ میں دی اِنَّ الَّذِین قالوا ربّنا اللّٰہُ ثمّ استقامُوا ۔جب انسان استقامت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر کربلائے وقت میں حسینؓ ابنِ علی کرم اللہ وجہہ کی صفاتِ عالیہ کا مظہر بن کر دنیا کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ حضرت امام حسینؓ اور اُن کے افرادِ خانہ نے کربلا میں آخری دَم تک صرف استقامت ہی کا مظاہرہ کیا آخر حق و باطل کے اتنے بڑے معرکے میں اپنی کوئی کرامت کیوں نہیں دکھائی۔ کیا معاذ اللہ وہ مادرزاد ولی یا کرامت دکھانے کے اہل نہ تھے؟ اگر امام حسینؓ سے کوئی کرامت ظاہر بھی ہوئی تو وہ فتح معرکۂ کربلا کے لیے نہیں بلکہ اپنی صداقت کے اظہار اور اتمامِ حُجت کے لیے تھا۔ نعوذ باللہ متأخرین اولیائے امت ،صحابہؓ اور اہلِ بیتؓ سے ولایت اور باطنی کمالات میں زیادہ تو نہ تھے۔ ہمیں کرامت کے وجود سے انکار نہیں، البتہ اس کی دورِ حاضر میں مروجہ تعریف اور استعمال سے اختلاف ضرور ہے اور بالخصوص جب کرامتِ حسّی کو کرامتِ معنوی یعنی علم پر فوقیت دی جاتی ہے تو حیرت ضرور ہوتی ہے اگر کرامات کا مقام علم سے زیادہ ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ چراغِ امت امام ابوحنیفہؒ سے جہاں علمی و تحقیقی کمالات جس کثرت سے ثابت ہیں، وہاں کرامات کے ظہور کا پتہ ہی نہیں ملتا اور نہ اُنہوں نے خود کبھی اپنے ایسے کمال کو بطورِ نمونہ پیش کیا البتہ جہاں بھی ضرورت پڑی کرامتِ علم کا اظہار بڑھ چڑھ کر کیا۔ یہی حال امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمدؒ بن حنبلؒ کا ہے۔ اُنہوں نے اور اُن جیسے ہزاروں آئمۂ وقت نے اپنے حریفوں کو محض اپنی علمی طاقت اور دلائل کی قوت سے شکست دی ، آخر بڑے بڑے مناظروں میں ہمارے اِن آئمہ نے کوئی کرامت کیوں نہیں دکھائی اور پھر کرامت پر محمول کوئی دعوٰی کیوں نہیں کیا؟ معلوم ہوا کہ کرامت کا وہ مفہوم جو ہم عرفِ عام کے حوالے سے سمجھتے اور بیان کرتے ہیں وہ درست نہیں۔ ورنہ مذکورہ بالا شخصیات کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آیا یہ لوگ کرامات دکھانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے یا پھر یہ لوگ مادرزاد ولی نہ تھے؟ شیخ سعدیؒ نے اِسی حقیقت کو اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں یوں واضح فرمایا۔

کرامت جواں مردی و ناں دہی ست

مقالاتِ بے ہودہ طبلِ تہی ست

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

اسی طرح بعض لوگوں کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ نے قادیانیت کا معرکہ محض کرامت سے سرَ کیا۔ اگر یہ بات ہوتی تو پیر صاحبؒ گولڑہ شریف میں بیٹھے بیٹھے مرزا کواپنے سامنے حاضر کرلیتے اور کرامت کے زور پر اُسے عقائدِ کفریہ ودعاوی کاذبہ سے تائب ہونے پر مجبور کردیتے، مگر پیر صاحبؒ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اُس کی دعوت پر لاہور تشریف لے گئے اور علمی گفتگواور دلائل کی روشنی میں احقاقِ حق وابطالِ باطل کرنا چاہا۔ آج کل اسی مناظرے کے حوالے سے ایک فقرہ خطیب حضرات بہت دہراتے رہتے ہیں پیر صاحبؒ نے فرمایا ''تم اپاہج اور برص کے مریض کوتندرست کردینے کی بات کرتے ہومیرے سامنے اگر مُردہ بھی لاؤ تو میں اُس مُردہ کوبھی زندہ کردوں گا'' اوّل تو حضرت صاحب نے یہ الفاظ یوں نہیں فرمائے ہوں گے کیونکہ ایسے الفاظ کہنا آپ کے مشرب ومزاج کے خلاف ہیں لیکن (علی وجہ التسلیم) اگر آپؒ نے فرمائے بھی ہوں تو وہ اپنی کسی کرامت یا کمال کے اظہار کی نیت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ اگر میں اس کے دین کی حفاظت کے لیے میدان میں نکلا ہوں تو وہ یقیناً مجھے رُسوا وشرمندہ نہیں کرے گا بلکہ میرے منہ سے نکلے کلمات کی لاج رکھے گا اور یہ بات بھی آپ نے مرزا کی چال بازیوں اور حیلہ سازیوں کے جواب میں کہی تا کہ وہ کسی طرح سامنے آئے اور اُس سے علمی گفتگو کرکے اُس کا کذب پوری دنیا پر واضح کیا جاسکے۔ مسئلہ ختمِ نبوّت چونکہ خالصتاً علمی مسئلہ ہے اگر اسے بزورِ کرامت حل کرنے کا ارادہ ہوتا تو آپ شمس الہدایہ اور سیفِ چشتیائی جیسی معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف نہ فرماتے۔ ان کتابوں کی تصنیف پر آپ نے جس قدر محنت فرمائی اور قرآن وسنت

کے علاوہ جن جن علوم وفنون کی کتابیں حوالہ جات کے لیے کھنگالیں اور ایک عرصہ لگایا تو کیا آپؒ نے یہ سب کچھ ویسے ہی یا اتفاقاً ہی کر دیا۔ ایسی بات ہرگز نہیں بلکہ آپ نے یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور قوّتِ کرامات سے زیادہ اپنی قوّتِ علمیہ کو فوقیت دی۔ اگر بالفرض وہ اپنی کرامت کے زور پر مرزا قادیانی کو جان سے مار دیتے تو مخالفین یہ کہتے کہ میدانِ عمل میں اترنے کی جرأت نہ تھی اسی لیے یہ اوچھا حربہ اختیار کیا۔ مگر پیر صاحب نے اس موضوع پر دو ایسی کتابیں تصنیف فرما دیں جو آپ کی علمی کرامت کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور کرامتِ حسّی کی حیثیت ان کے سامنے ہیچ ہے۔ قیامت تک ختمِ نبوّت کے موضوع پر ریسرچ کرنے والے انہیں پڑھیں گے اور آنے والی نسلیں آپؒ کی اس علمی کرامت سے حیاتِ نو حاصل کرتی رہیں گی۔ کرامت حسّی وقتی اور عارضی چیز ہوتی ہے جس کی عینی شہادت سے مستقبل کا دور محروم رہتا ہے اور جس کی حقانیت کو قبول کرنے کے لیے ہزار ہا وسوسے ذہن میں جنم لیتے رہتے ہیں، مگر سیفِ چشتیائی اور شمس الہدایہ جیسی علمی کرامات لافانی ہوتی ہیں، جنہیں ہر دور کا بیدار مغز خود دیکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ بلکہ اُس وقت بھی محقق علماء و غیر جانبدار اکابر نے حضرت پیر مہر علی شاہؒ کی تعریف وتوصیف، آپ کی علمی و تحقیقی نگارشات وتالیفات کے حوالے سے ہی کی بلکہ کرامات وتصوّف کے دلدادہ بزرگوں نے بھی اسی پہلو سے آپ کو سراہا۔ "مہرِ منیر" کا یہ اقتباس اس سلسلے میں قابلِ مطالعہ ہے

حضرت کی یہ تصنیف یعنی سیفِ چشتیائی اپنے نادر استدلال، بلند پایہ علمی مضامین اور مسئلہ زیرِ بحث پر سوال وجواب کے پیرایہ میں واضح اور دلنشین انداز اور تجزیہ کے باعث نہایت مقبول ہوئی اور آج نصف صدی گزرنے پر بھی بار بار طبع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی ہے۔ بلند پایہ علماء کے طبقہ میں تو بالخصوص اس کی بہت مانگ ہے مولوی اشرف علی تھانوی اپنی تفسیر بیان القرآن میں آیت وَ قَولِهِم اِنَّا قَتَلنَا المَسِيحَ عِيسَى ابنَ مَريَمَ رَسُولَ اللّٰهِ۔ (سورۂ نساء آیت نمبر 157) کے ذیل لکھتے ہیں

" اور حیات وموتِ عیسوی کی بحث میں کتاب سیفِ چشتیائی قابلِ مطالعہ ہے" اسی طرح دیو

بند کے شیخ الحدیث علاّمہ انور شاہ کشمیری نے بھی اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰی علیہ السلا
م کے دیباچہ میں سیفِ چشتیائی کو مسئلہ حیاتِ مسیح پر ایک بہترین اور کافی وافی تصنیف قرار دیا ہے
.....ہندوستان کے مشہور مفتی، عالم اور ریاست رام پور میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل مولنا فضلِ حق رام پوری نے ایک سال اجمیر شریف میں عرس کے موقع پر حضرت بابو جی مدّ ظلہ العالی (علیہ الرحمۃ) سے حضرت قبلۂ عالم قدس سرّہ العزیز کی تصنیف کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''یوں تو حضرت کے کمالات بہت بیان ہوئے ہیں لیکن میں تو اُس دماغ کا شیدائی ہوں جس سے سیفِ چشتیائی ظہور میں آئی'' (مہرِ منیر صفحہ نمبر 251,250 مطبوعہ گولڑہ شریف 1987ء)

اگر اس وصفِ عالی کو ''والفضلُ ماَ شَھِدَتْ بِہِ الاعداء'' کے تناظر میں آپ حضرت پیر مہر علی شاہؒ کی علمی کرامت نہیں کہیں گے تو آخر اِس کا اور کیا نام رکھیں گے؟

پیر ہرات حضرتِ عبداللہ انصاریؒ جو حضرتِ ابوایّوب انصاریؓ (میزبان رسولؐ) کے پڑپوتے ہیں اپنے اقوال میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "اگر بر ھو اپری مگسے باشی، وگر بر آب روی خسے باشی، دل بدست آرتا کسے باشی" یعنی تُو اگر ہوا پر بزورِ کرامت اُڑتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ تُو ایک مکھی ہوگا کیونکہ وہ بھی تو اُڑ لیتی ہے اور اگر تُو پانی پر چل لیتا ہے تو تیری حیثیت تنکے سے زیادہ نہیں کیوں کہ تنکا بھی سطحِ آب پر تیر لیتا ہے۔ ہاں اگر تُو نے کچھ بننا ہے تو کسی انسان کا دل راضی کر، خلقِ خدا کی دعائیں لے تا کہ تُو انسانوں کے زمرے میں داخل ہو سکے۔ یاد رہے کہ عبداللہ انصاریؒ وہ شخصیت ہیں جنہیں مولانا جامیؒ نے پیر ہرات کا لقب دیا اور اُن کی تعریف میں متعدد شعر کہے جو اُن کے مزار پر آج بھی کندہ ہیں۔ حضرت بابو جیؒ کے ساتھ جب میں ہرات میں اُن کے مزار پر حاضر ہوا تو میں نے وہ اشعار وہاں لکھے ہوئے دیکھے تھے۔ علاوہ ازیں یہ کہ فارسی عبارت میں صرف شیخ سعدیؒ اِن کے اسلوبِ تحریر کا تتبع کر سکے چنانچہ گلستانِ سعدیؒ کی دلپذیر عبارت اور نپے تُلے حکمت آمیز جملے اِس دعوٰی کی بیّن دلیل ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ پیر ہراتؒ نے بھی محض کرامات کو معیارِ بلندیٔ درجات تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا عوام کے سامنے بزرگانِ دین کی

کرامات کے محض قصے بیان کرنے کے بجائے اُن کی علمی خدمات اور قابلیتوں کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ ایک پڑھا لکھا انسان اور میڈیا کے اِس دور میں سانس لیتا ہوا ایک باشعور ذہن جس قدر علمی دلائل سے قائل ہوتا یا ہوسکتا ہے وہ کرامات کے قصے کہانیاں سنانے سے نہیں ہوتا، کیوں کہ جس کرامت کا ذکر کیا جارہا ہے وہ اُس نے بچشمِ خود دیکھی ہی نہیں کہ وہ اُسے تسلیم کرسکے، بلکہ ایسے موقع پر آزاد خیال لوگ کہہ دیا کرتے ہیں بقول حافظؒ ؎

با خرابات نشیناں ز کرامات ملاف
ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

جبکہ کتاب اور علمی دلائل ایسے زندۂ جاوید کرامات ہیں کہ قیامت تک آنے والا ہر معقول اور ذہین انسان انہیں سمجھ لینے کے بعد اُس شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن درگاہوں میں واعظین اور خطباء زیادہ تر صاحبِ مزار کے کرامات بیان کرنے پر زور دیتے ہیں اور اُن کے پیش کردہ علمی نکات بطورِ درس و تدریس عوام کے سامنے نہیں لاتے یا لانے کی اہلیت نہیں رکھتے، وہاں محفل میں آنے والے پڑھے لکھے غیر جانبدار حضرات معترض ہوتے ہوئے کہتے ہیں دیکھئے! یہ لوگ بزرگوں سے منسوب کرامات کے پلندے عوام کے سامنے اس لیے کھولتے ہیں کہ جاہل عوام اُس پیر کو بہت بڑا پیر سمجھ کر اُس کے دیوانے بن جائیں۔ یہ خوشامدی خطیب پیروں کی دکانیں چمکانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک خطباء کا یہ عمل عوام الناس کو پھانسنے اور صرف پیروں کو مرکزِ توجہ بنانے کا محض ایک داؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے حتی الوسع صوفیائے کرام کی تعلیمات اور علمی خدمات کو زیرِ بحث لانا چاہیے۔ اسی لیے سیّدہ عائشہ صدیقہؓ نے حضور علیہ السلام کے بارے میں ایک سوال پر فرمایا تھا ''کَانَ خُلُقُهُ القرآن'' کہ آپؐ کے اخلاقِ عالیہ قرآن مجید کی تفسیر تھے۔ یہاں بھی امّ المؤمنینؓ نے حضورؐ کے کسی معجزہ کو بیان کرنے کے بجائے آپؐ کے اخلاقِ عالیہ کا تذکرہ فرمایا، حالانکہ آپ کی ذاتِ اقدس جامع المعجزات ہے چونکہ معجزات کا ذکر انسانی

زندگی پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا، جس قدر آپ کے اخلاقِ عالیہ اور طرزِ حیات اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس لیے حضرتِ عائشہؓ نے اخلاقِ عالیہ کو ذکرِ معجزات پر فوقیت دی اور آپ کی پوری حیاتِ طیبہ کو قرآن کی عملی تفسیر فرمانے پر اکتفا کیا۔

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت گولڑویؒ نے پھر یہ کیوں فرمایا تھا کہ جس کا قلم خود اُٹھ کر لکھے وہ حق پر ہوگا اور یہ کہ ایسے لوگ بھی امتِ محمدیہ میں موجود ہیں کہ اگر اُن کے سامنے مُردہ بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے زندہ کر دکھائیں یہ بات تو حضرت گولڑویؒ کے باکرامت ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ حضرت گولڑویؒ کے باکرامت ہونے میں کم از کم مجھے تو کوئی شک نہیں، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ علم اور کرامت کے مابین فرقِ مراتب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ علم کا یہ مطلب نہیں کہ اُسے حصولِ مال و دولت کے لیے حاصل کیا جائے یا محض لفظوں سے کھیلنے کے لیے سیکھا جائے یا اپنی علمی برتری و تفوق ظاہر کرنے کے لیے یا مناظرہ بازی کے لیے پڑھا جائے، میں تو اُس علم کی بات کر رہا ہوں جو محض اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دین کی خدمت کے لیے حاصل کیا جائے اور پھر اُس علم کے مقاصدِ حصول کو سامنے رکھتے ہوئے الفاظ کی دنیا سے جہانِ معنٰی میں بھی قدم رکھا جائے۔ ایسا علم اُس طالب علم کو عارفِ ذات و صفات بنا دیتا ہے اور جب عرفانِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے تو انسان کا قلب انوارِ الٰہیہ سے جگمگا اُٹھتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے عالم کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تیر بہدف ثابت ہوتا ہے اور اُس کے اندر تاثیر کی وہ دنیا پنہاں ہوتی ہے کہ سماعتیں رقص کرنے لگتی ہیں۔ قال حال میں بدل جاتا ہے۔ الفاظ میں معانی دکھائی دینے لگتے ہیں یہ وہ منزل ہے کہ جہاں سکوت، گویائی کا کام دینے لگتا ہے اور گویائی دلوں میں ایک کہرام مچا دیتی ہے بقولِ مولنا رومیؒ ۔

علم را بر دل زنی یارے بود

علم را بر تن زنی مارے بود

بلاشبہ میرے جدِ اعلیٰ حضرت پیر مہر علی شاہؒ ایسے ہی علم کے وارث تھے۔ اُن کا علم بجائے خود ایک کرامت کے درجے پر فائز ہو چکا تھا۔ لیکن یہ کسی ایک ذات سے مخصوص نہیں، بلکہ جو بھی اِس تجربہ گاہ سے گزرے، بشرطیکہ فضلِ ایزدی بھی اُس کے شاملِ حال ہو، تو وہ اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ جہاں تک حق و باطل کے معرکے کی بات ہے تو جب اللہ تعالیٰ حق کو کسی کے ہاتھ پر ثابت کرنا چاہتا ہے تو اُس کے ہر دعوے کو بھی سچا کر دکھاتا ہے۔ اِسے بندے کی طرف منسوب ہونے کے اعتبار سے تو کرامت کہا جا سکتا ہے، مگر حقیقتاً یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے، اِس میں بندے کے ذاتی ارادے اور تصرّف کو قطعاً دخل نہیں ہوتا۔ حضرت گولڑویؒ نے اِسی اٹل حقیقت کی طرف اشارہ خود بھی کر دیا ہے "مہر منیر" کے صفحہ 234 پر آپ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ "میں نے دعوٰی از خود نہیں کیا تھا، بلکہ عالمِ مکاشفہ میں جناب نبی کریم ﷺ کے جمالِ با کمال سے میرا دل اِس قدر قوی اور مضبوط ہو گیا تھا کہ مجھے یقینِ کامل تھا کہ اِس سے بھی بڑا دعوٰی کرتا تو اللہ تعالیٰ ضرور مجھے سچا ثابت کرتے"۔ معلوم ہوا جب کرامت صادر ہو جائے تکبّر و غرور کر کے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اِسے فضلِ باری تعالیٰ ہی قرار دینا چاہیے، جیسا کہ دربارِ سلیمانؑ میں آنکھ جھپکنے کی دیر میں تختِ بلقیس حاضر کیا گیا، چاہے وہ کسی فرشتہ کا کام تھا، عالمِ کتاب ولی کا کارنامہ یا بذاتِ خود حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ (جیسا کہ کتبِ تفسیر کے حوالہ سے تحریر کر دیا گیا ہے) حضرتِ سلیمانؑ نے فوراً فرمادیا هذا من فضلِ ربّی لیبلوَنی ء اَشکُرُ اَم اکفُرُ ۔ کہ یہ میرے رب کا فضل و کرم ہے تا کہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت۔ یہاں سلیمان علیہ السلام نے اِس کمال کو ربّ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اِسے اپنے لیے امتحان قرار دیا، حالانکہ پیمبرانہ عظمت اور معجزانہ شان کے آگے ولایت و کرامت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، چہ جائیکہ کوئی ولی بطورِ مفاخرت، کرامت ظاہر کرے یا پھر اُسے اپنی طرف منسوب کرنے کی جرأت کر سکے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نمرود نے آگ میں پھینکوایا تو حضرت ابرہیمؑ کا یہ ارادہ نہ تھا کہ وہ خود آگ میں کود کر پھر آگ کو ٹھنڈا کر دیں اور دنیا کو یہ باور کرائیں کہ میں صاحبِ معجزہ شخصیّت ہوں

،مگر جب نمرود نے آگ میں جبراً پھینکوا دیا تو پیغمبرؑ کی استقامت ،خلوص اور رب تعالیٰ پر توکلِ کامل کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے آگ کو گلزار بنا دیا چنانچہ قرآن کریم نے اِس واقعہ کو یوں بیان فرمایا:

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًاوَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ۔ترجمہ: اور ہم (اللہ تعالیٰ) نے کہا کہ اے آگ تُو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک ہو جا اور اُس کی سلامتی کا باعث بن جا۔ چونکہ یہ کفر و ایمان شرک وتوحید اور حق و باطل کا ایک عظیم معرکہ تھا اِس لیے اس کی تمام تر ذمہ داری اُسی ذات نے اپنے ذمہّ لی ،جس نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ نبوّت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود آگ کے ٹھنڈا ہو جانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آگ سے یہ کہا۔ نہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے از خود ایسا کہا اِس سے ثابت ہوا کہ عُرف میں ہم اِسے معجزۂ ابراہیمی تو کہہ سکتے ہیں ،مگر قرآن مجید کی رو سے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا ظہور تھا ۔اِسی طرح جہاں بھی قرآن مجید میں کسی نبی یا رسول نے کسی ایسی بات کو اپنی طرف منسوب کر کے کہا تو وہ بھی حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کے تحت فرمایا ،یعنی اُس کا فاعل حقیقی بھی اللہ تعالیٰ ہی تھا انبیاء ورُسُل نہ تھے یہی بات اولیاء کی ہے ،جب کسی حق بات کو ثابت کرنے کے لیے کمالِ یقین سے یہ لوگ زبان سے کوئی دعویٰ صادر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کرنے اور اپنے بندگانِ خاص کو دشمنوں کے رُوبرو شرمندگی سے بچانے کی خاطر اُن کے دعووں کو سچّا ثابت کر دکھاتا ہے ۔حدیث شریف میں وارد لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ کا مفہوم بھی یہی ہے اور یہ منزلِ یقین علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ۔خلاصہ کلام یہ نکلا کہ حضرت گولڑویؒ کی سب سے بڑی کرامت اُن کا ظاہری علم تھا ،جس سے مرعوب ہو کر مرزا قادیانی اُن کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کر سکا اور پھر اُس موقع پر حضرت گولڑویؒ نے کوئی حسّی کرامت پیش بھی نہیں کی بلکہ صرف اُس کا ذکر فرمایا۔ اِس کے برعکس اپنی علمی کرامت ایسی دکھائی کہ اُن کی مصنفہ شمس الہدایہ اور سیف چشتیائی دیکھتے ہوئے آج بھی دنیائے مرزائیت لرزہ براندام ہو جاتی ہے اور اُن کی اِس علمی کرامت اور دلائل و براہین کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے سامنے مرزائیت کی زورقِ ناتواں جرأتِ مزاحمت نہیں کر پاتی ۔لہٰذا جن

حضرات کا خیال ہے کہ بزرگانِ دین محض کرامتِ حسّی کے سہارے دشمن کو شکست دیتے ہیں، وہ شدید غلطی پر ہیں، اس لیے کہ کرامتِ حسّی کرامتِ علمیہ کے سوا معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتی اور پھر کرامتِ حسّی اکابر صوفیاء کے نزدیک کوئی ایسا وصف بھی نہیں، جس کے سبب انسان پر دوسرے انسانوں کی نسبت فضیلتِ کلّی کا حکم لگایا جا سکے۔

الغرض مرزائے قادیانی نے قبلہ پیر صاحب گولڑویؒ کی کراماتِ حسیہ کی شہرت سُن کر اُنہیں مناظرے کا چیلنج نہیں دیا تھا، بلکہ اُن کی علمی شہرت کے سبب اُنہیں میدانِ مقابلہ میں اترنے کی دعوت دی تھی، مگر جب دیکھا کہ وہ تو مقابلے کے لیے لاہور پہنچ گئے ہیں اور پھر وہ صرف کسی خانقاہ کے مجاور یا محض ایک رسمی سجادہ نشین ہی نہیں، بلکہ وہ تو علومِ شرعیہ کے ایک بحرِ ذخار ہیں تو اُس نے خفت سے بچنے کے لیے شعبدہ بازی پر محمول دعوے شروع کر دیے تا کہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف مبذول کر دی جائے اور وہ (مرزا قادیانی) کسی طور پر پیر مہر علی شاہؒ کے ساتھ علمی گفتگو کرنے سے بچ سکے۔ پیر صاحبؒ نے جواب میں جو کچھ کہا وہی کچھ کہنا مناسب تھا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر احقاقِ حق کے لیے ایک عام بندۂ مومن کے دعوے کو بھی عملی شکل دے دیا کرتا ہے۔ یہ تو حضرت گولڑویؒ جیسے عالم و فاضل اور یگانۂ روزگار انسان کا معاملہ تھا۔ لہٰذا حضرت گولڑویؒ نے مرزا قادیانی کے جواب میں اُس دن جو دعوے فرمائے اللہ تعالیٰ حق کو ثابت کرنے کیلئے اُنہیں ضرور پورا فرماتا۔

اِس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کرامات کا مقام علم سے کم ہے اور یہ کہ کرامات کے صدور کی بنیاد علم و تقویٰ پر ہے، علم کے بغیر جو شخص مقامِ ولایت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے دعویٰ میں ہرگز سچا نہیں بلکہ وہ محض لوگوں کو فریب دیتا ہے اور ایسے واعظ و خطیب حضرات جو فضیلتِ علم اور بزرگانِ دین کے علمی کارنامے بیان کرنے کے بجائے فقط کرامات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں، وہ انسان کی طبعی اور نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چونکہ انسان طبعاً اُعجوبہ پسند واقع ہوا ہے اِس لیے جب اِس کے سامنے خلافِ عقل و عادت واقعات ذکر کیے جائیں تو یہ انہیں اُن واقعات کی نسبت جو عادت اور معمول کے مطابق ہوں ترجیح دیتا ہے اور اُن سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ کرامات کی دنیا برحق

سہی ،مگر عوام پر ان کا الٹا اثر پڑتا ہے اور وہ تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کو ترک کر دیتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات سے زیادہ چِلّہ کشی اور وظائف خوانی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں تا کہ وہ ولی بن کر بزرگوں کی طرح کرامتیں دکھاتے پھریں۔ جاہل ہونے کے سبب رات دن کی اورادخوانی اور چلہ کشی اُنہیں ولی بنانے کے بجائے پاگل اور دیوانہ بنا دیتی ہے چنانچہ اکثر کیس ہمارے سامنے آتے ہیں، پھر اُنہیں مینٹل ہسپتالوں میں زیرِ علاج رکھا جاتا ہے، حالانکہ مناسب حد تک اورادخوانی وچِلّہ کشی علم والوں کے لیے کوئی مُضر چیز بھی نہیں، بلکہ مفید ہے مگر یکدم مرتبۂ ولایت پر فائز ہونے کا شوق اکثر جاہلوں کو پاگل بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اولیاء اللہ کی علامت چوں کہ وظائف واورادخوانی اور چلّہ وفاقہ کشی ہوتی ہے اِس لیے ہم قرآن وسنت کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے براہِ راست اُس مقام پر فائز ہو جائیں، جس کی بدولت ہم سے ضرورت کے وقت کرامات کا ظہور ہو سکے۔ عوام کا یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل خطیبوں کی اُن تقاریر کا مرہونِ منت ہوتا ہے، جو اولیاء کے محض کرامات کا تذکرہ کر کے محفل کو گرمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''مہرِ منیر'' میں حضرت گولڑویؒ کے ایک ایسے ہی جلد باز ہم درس مولوی سیّد احمد صاحب کا واقعہ درج ہے، جس کو ہم ''مہرِ منیر'' ہی کے صفحہ 95 سے نقل کرتے ہیں۔

(ایک دفعہ سیال شریف میں حاضری پر آپ ''حضرت گولڑویؒ'' کو معلوم ہوا کہ یہ مولوی سیّد احمد وہیں درویشوں میں مقیم ہیں، مگر نماز وغیرہ فرائض ترک کر چکے ہیں۔ حضرتؒ نے ملاقات پر اُنہیں فرمایا۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم میں سے انسانیت رخصت ہو چکی ہے اور صرف حیوانیت باقی رہ گئی ہے''۔ اُس نے کہا کہ میں آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ میری طرح تعلیم وتدریس ترک کر کے ذکرِ جہر اختیار کریں، کیونکہ تعلیم وغیرہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حضرت قبلۂ عالم قدس سرّہٗ نے فرمایا کہ قطع نظر تمہاری اس ظاہری حالت کے ترکِ تعلیم و تعلّم سے اگر تم نے کوئی خاص فائدہ حاصل کیا ہے تو مجھے بتلاؤ تا کہ اُسے پیشِ نظر رکھ کر میں بھی تمہاری نصیحت پر غور کر سکوں۔ مجھے تم میں سوائے اِس کے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ تمام رات ذکرِ جہر کرنے کے باعث تمہیں قدرے رقّتِ قلبی تو

حاصل ہوگئی، مگر اسے عرفان نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جسے عرفان حاصل ہو جائے وہ اتباعِ نبوی ﷺ کا تارک ہرگز نہیں ہو سکتا)

قارئین کرام! اس مندرجہ بالا اقتباس کو بار بار پڑھیں، خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں اور پھر اِس حقیقت کا کھلے دل سے اعتراف کریں کہ جب آدمی تعلیم و تدریس اور پڑھنے پڑھانے کو ترک کر دیتا ہے تو اُس میں سے انسانیت رخصت ہو جاتی ہے کیونکہ بقولِ شیخ سعدیؒ انسانیت کا کمال علم ہی کا مرہونِ منت ہے ۔

بنی آدم از علم یابد کمال

نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

اور وہ محض حیوان ہو کر اسفل السّافلین کے درجے پر آ جاتا ہے۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ذکرِ جہر پر جو رقت قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اُس کا نام ہرگز ہرگز عرفان نہیں کیونکہ عرفان تو اتباعِ نبوی ﷺ ہی کا نام ہے اور نبی کریم ﷺ تمام عمر اِنّما بُعثتُ معلّماً پر عمل فرماتے رہے، اور اپنے اِس منصبِ جلیلہ کے فرائض عظیمہ ادا فرماتے رہے، جس پر آپ کو فائز کر کے فرمایا گیا ویعلّمھم الکِتٰبَ وَالحِکمۃ آپؐ نے کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے حیاتِ طیّبہ بسر فرمائی نہ کہ اپنے صحابہ کرام کو کرامات دکھانے کی مشق کرواتے رہے۔

میرے دادا حضرت بابو جیؒ کے سامنے جب کوئی ایسا کیس پیش ہوتا کہ فلاں جاہل چلّہ کش پاگل بن کر لوگوں کو تنگ کرنے لگ گیا ہے تو آپؒ نہایت غصے میں فرمایا کرتے تھے کہ تم اور اد خوانی اور چلّہ کشی سے کیا بننا چاہتے ہو یاد رکھو ان چیزوں کے لیے نیّت کی درستگی ضروری ہے اللہ تعالیٰ چلّہ کشی اور وِرد وظیفوں کے جال میں پھنسنے والا نہیں، وہ انسان کی نیّت پر اپنا فیصلہ سنایا کرتا ہے اور ولایت و مقبولیّت کا تعلق محض کسب و عمل سے نہیں، بلکہ یہ ازلی سعادت جس کے حصے میں کر دی گئی اُسی کو ملتی ہے، فضول ٹکریں مارنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درست ہے کہ صوفیاء اوراد خوانی اور چلّہ کشی بھی فرمایا

کرتے تھے، مگر اُن کی اساس علمِ شریعت تھا۔ جس کی بنا پر وہ ایک مخصوص مقامِ ولایت پر فائز ہو جاتے تھے۔ اگر علمائے کرام و خطباء حضرات اپنے مواعظ و خطبات میں مقاماتِ صوفیاء بیان کرتے ہوئے حصولِ علم کو بھی اساسی حیثیت دیتے اور قرآن و سنّت کی تعلیمات کی طرف عوام کو زیادہ راغب کرتے تو آج اورادخوانی اور چلّہ کشی کے ہاتھوں لوگ پاگل بننے سے بچ جاتے۔

اِس ساری بحث کا مقصد نہ تو وجودِ کرامت سے انکار ہے اور نہ ہی بزرگانِ دین کے کمالاتِ روحانیہ کی تردید، بلکہ اِس جدید ترقیاتی دور میں روشن خیال طبقہ کو ایک پریکٹیکل اور عملی لائحہ عمل پیش کرنا ہے، کیونکہ آج کے دور کا پڑھا لکھا انسان قصے کہانیوں پر کان دھرنے کے بجائے ایک ٹھوس حقیقت کا متلاشی ہے، اِسی لیے جس قدر اعتراضات آج کشف و کرامات پر کئے جاتے ہیں، شاید ہی کبھی پہلے کئے گئے ہوں۔ اگرچہ کچھ اعتراضات محض مخالفت و خصومت کی بناء پر بھی کئے جاتے ہیں، مگر مخالف کے ہر اعتراض کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے اغماض برتنا بھی قرینِ انصاف نہیں۔ اگر اُس کا مسکت و مدلّل جواب پاس نہ ہو تو پھر اُسے تسلیم کرنا علمی دیانت ہے۔ غیر مدلّل اور بھونڈے جوابات وقیع اعتراضات کو زائل نہیں کر سکتے لہٰذا دیانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ مخالفین کے وقیع اعتراضات کا یا تو مسکت جواب دیا جائے یا پھر اُن کے وارد کردہ اعتراضات کو دُرست قرار دیا جائے۔ ہمارے اکابر علماء، فقہاء اور صوفیاء کا یہی چلن رہا۔ مخدومِ اُمم علی ہجویری لاہوریؒ کی کتاب کشف المحجوب کے مطالعہ سے ایسے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں، آپ کا دور تقریباً تصوّف کا ابتدائی دور ہے۔ آپ نے جو اعتراضات اپنے معاصر متصوّفین پر وارد کئے۔ اُن کو پڑھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ اگر خیرُ القرون قرنی کی حدیث سے قریب تر ادوار کا یہ عالم تھا تو بعد کے ادوار میں کس قدر بدعات، مختلف عقائد و رسوم کی صورت میں اسلامی معاشرے میں داخل ہوئی ہوں گی۔ اگر آج کا کوئی ناقد تصوف کے بعض معتقدات و رُسوم پر اعتراض کرتا ہے تو یہ دیکھ کر اُسے منکرینِ تصوّف میں شمار نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ایسے اور اِس سے کہیں زیادہ وقیع اعتراضات خود صوفیائے کبار نے بھی صوفیاء پر کئے، جو نظم و نثر کی صورت میں اُن کی تصانیف میں آج تک موجود

ہیں ۔ آخر اُن کو کس کھاتے میں رکھا جائے گا لہٰذا یہ کہنا کہ صوفیاء کے کسی قول، عمل یا اُن کی درگاہوں میں رواج یافتہ رُسوم پر اعتراض کرنا صرف مخالفین کا طریقہ ہے، غلط ٹھہرا کیونکہ اعتراض کا مقصد صرف تذلیل ہی نہیں ہوا کرتا، بلکہ بعض اوقات صورتِ حال شرعی دلائل کی روشنی میں سمجھنا مطلوب ہوتا ہے، ایسی صورت میں معترض کے اعتراضات کا جواب مدلّل انداز اور شائستہ لب و لہجہ میں پیش کرنا چاہئے نہ کہ اوچھے اور بازاری انداز میں ۔ ہمارے ذی علم مشائخِ سلف کا یہی شیوہ رہا اور اُن کا یہ طرزِ عمل اُدع الیٰ سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة کی تفسیر تھا لہٰذا بقولِ علاّمہ سیمابؔ ۔

اپنے معیارِ محبت پہ نگاہِ تنقید
نہیں معلوم یہ کس کس کی نظر سے گزرے

مخالفین تو یہاں تک بھی اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ سارا نظامِ حیات کراماتِ صوفیاء پر چل رہا ہے تو جس خالق نے یہ سب کچھ پیدا کیا اُس کی قدرت کے ظہور کی علامت اور وقت کو کیسے متعیّن کیا جائے گا کیونکہ مریدین اور عقیدت مندوں کے نزدیک اُن کے احوال میں جو اچھے بُرے اثرات ظاہر ہوتے ہیں وہ اُن کے پیروں کی توجہّ و عدمِ توجہّ کے مرہونِ منت سمجھے جاتے ہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرامات کی اِس بھیڑ میں اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت دکھانے اور اپنی مخلوق پر اپنے تصرّف کے اظہار کا وقت کب دیا جائے گا ۔

اِس مندرجہ بالا اعتراض کا مناسب اور قرینِ حقیقت جواب یہی ہے کہ ہمارے باکمال مشائخ سلف نے کبھی اور کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہمارے ماحول میں خیر و شر کا جو ظہور ہوتا ہے وہ ہماری توجہّ یا عدمِ توجہّ، خوشنودی یا رنجش کی بدولت ہوتا ہے ۔ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے تو مشرک ہے بلکہ ہمارے باکمال مشائخ خیر و شر کے اِس سارے ظہور کو مالکِ حقیقی کی قدرتِ کاملہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ جاہل واعظین اور خوشامد پسند مریدین اگر اِس سارے کھیل کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کرتے

ہیں تو یہ اُن کا قصور ہے مشائخِ سلف اِس عقیدے اور اندازِ فکر سے براءت کا اظہار کرتے آئے ہیں۔
آپ نے دیکھا کہ خوشامدی واعظین اور جاہل عقیدت مندوں کے اِن مبنی بر جہالت عقائد نے پاکباز اور پاک نہاد مشائخ وصوفیاء کو بھی مخالفین کا نشانہ تنقید بنا دیا ہے۔ حضرت پیرانِ پیر کا مصرع ۔ع لقام بقُدرۃِ المولیٰ مشی لی اِس پر دلیل ہے کہ آپؒ نے میّت کے اُٹھنے کی نسبت قدرتِ باری تعالیٰ کی طرف فرمائی ہے نہ یہ کہ وہ میری قدرت سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یا یہ کہ میں صاحبِ کرامت وعزّت ہوں یا پھر واقعۂ تختِ بلقیس کے ضمن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا، ھذا من فضلِ ربّی اسی اٹل حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سب کچھ کرنے والا قادرِ مطلق اللہ ہی ہے البتہ بندوں پر وہ کبھی کبھی اپنے فضل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

میں نے حضرت بابوجیؒ کا بھرپور عہد دیکھا ہے، چونکہ وہ میری تعلیم کا دور بھی تھا اِس لیے فرصت ملنے پر ہی آپؒ کی باتیں سُننے کا موقع ملتا تھا، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا ذہن اُن کے ارشادات کی دولت سے خالی ہے بلکہ وافر مقدار میں آپؒ کے ملفوظات کا وہ علمی ذخیرہ جو توحید و رسالت، تصوّف اور دیگر دینی و دنیوی موضوعات پر مشتمل ہے، اب تک پوری قوّت کے ساتھ میرے لوحِ ذہن پر نقش ہے، صرف اتنا افسوس ضرور ہے کہ جو لمحات آپ کی معیّت میں نہ گزر سکے اور درسِ نظامی کی تکمیل کی وجہ سے جن مجالس میں شریک اور جن سفروں میں آپ کے ساتھ نہ جا سکا اُن کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔
بقولِ شاعر ؎

نالہ از بہر رہائی نکند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانیکہ گرفتار نہ بُود

بہرحال پھر بھی ان شاء اللہ اپنے قارئین کو آپؒ کے ملفوظات کے سرمدی لطف سے محروم نہیں رکھوں گا۔ جو لوگ اکثر آپؒ کے ساتھ رہے اور جن کو مجھ سے زیادہ وقت آپ کی معیّت میں گزارنے کا ملا اگر یہ کام وہ خود کر لیتے تو آج بات ہی کچھ اور ہوتی۔ میں نے بزرگ متوسّلین سے سنا

ہے کہ لال کرتی والے منشی عبدالرّحیم صاحب مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ماحول نے حضرت بابو جیؒ کی قدر نہیں کی، صرف ساتھ وقت گزار لینے کو بہت کچھ سمجھا، مگر اُن کی گفتگو اور اُن کی شخصیّت کی قدر قریب ترین رہنے والے بھی نہ کر سکے، منشی صاحبؒ کی اِس بات سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے آپ کے خطوط کی شکل میں جو چند چیزیں سامنے آئیں وہ بھی غنیمت ہیں، مگر وہ بھی آپؒ کے ابتدائی دور کے مشاہدات ہیں، آخری دور کے ملفوظات ومشاہدات کا احصاء نہ ہو سکا۔

محترم مفتی گُل رحمٰن صاحب، زید مجدہٗ برمنگھم (لندن) میں رہتے ہیں، جب میرے حالیہ سفر لندن میں مجھ سے ملے تو حضرت دادا صاحبؒ کی شخصیّت پر گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ ایک مرتبہ کسی نے آپ سے ولایت کی جامع تعریف پوچھی۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں میں بھی اُسی مجلس میں حاضر تھا۔ آپؒ نے جواب میں فرمایا کہ ولایت کرامات دکھانے کا نام نہیں، یا وہ شخص ولی نہیں جو صرف کرامات دکھائے بلکہ ولایت، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کلّی یقین رکھنے کا نام ہے کہ انسان ہر زاویۂ فکر کے اعتبار سے اُسی کی ذات کو مرکز ومقصود سمجھے جب انسان توحید کے اِس مقامِ عالی پر فائز ہو جاتا ہے تو اُسے ولایت کا درجہ خود بخود مل جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے یہ بیان کر کے فرمایا کہ آپ نے دیکھا کہ حضرت بابو جیؒ نے ولایت کی کس قدر مختصر اور جامع تعریف فرمادی جو آج تک میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھی۔ میں نے مفتی صاحب کی بات کو مزید تقویت دینے کے لیے گزارش کی کہ حضرت دادا صاحبؒ نے ولایت کی جو تعریف فرمائی ہے وہ تو اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کی تفسیر ہے۔ یہ سن کر مفتی صاحب مزید خوش ہوئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہر حیثیت سے یقین رکھنا اور پھر اِس پر استقامت اختیار کئے رہنا ہی ایک بندۂ مومن کے کامل الایمان ہونے کی دلیل اتم ہے اور یہی ولایت ہے، مگر ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ ہم عوام کے سامنے وہ چیزیں بیان نہیں کرتے، جن کی تعلیم قرآن وسنت اور پھر خود صوفیاء نے دی، بلکہ صرف اُن کے کشف و کرامات کے بیان کو کافی سمجھتے ہیں اور اُن عوامل کا عمداً ذکر نہیں کرتے جن کی بناء پر وہ اِن مقامات کے قابل بنے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خانقاہوں میں آنے والے سادہ لوح مسلمان عقائد کے لحاظ

سے اِس قدر پسماندہ ہیں کہ اگر محفل میں کوئی خارقِ عادت محیّر العقول واقعہ کسی بزرگ ولی کی طرف منسوب کر کے بیان کر دیا جائے تو خوب داد دیتے اور نعرے لگاتے ہیں، لیکن اگر اِسی نوعیت کا کوئی واقعہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو مایوسی و خاموشی کی تصویر بن جاتے ہیں گویا آیتِ قرآنی وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحدَہٗ اشمأزّت قلوب الّذینَ لا یؤ منو ن بالآخرۃِ وَ اِذَا ذُکِرَ الَّذینَ من دونہٖ اِذا ھُم یستبشِرُونَ ۔ ترجمہ: جس وقت یاد کیا جاتا ہے اللہ اکیلا ،نفرت کرتے ہیں دل اُن لوگوں کے کہ نہیں ایمان لاتے ساتھ آخرت کے اور جس وقت کہ یاد کیے جاتے ہیں وہ لوگ کہ سوائے اس کے ہیں، ناگہاں وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ لوگ شرک جیسے نا قابلِ علاج مرض میں غیر شعوری طور پر غیر محسوس طریقے سے مُبتلا ہوتے ہیں، مگر اِس کا بنیادی سبب خوشامدی واعظین، جاہل خطباء اور خود پرست و خودنگر گدّی نشین حضرات ہیں جو احبار و رُھبان بن کر غریب عوام کی دولت بھی ہڑپ کر رہے ہیں اور ان بے چاروں کی متاعِ ایمانی کو بھی لوٹ رہے ہیں۔

تصوّف پر اعتراض و انکار کی بات ہو رہی تھی اِسی سلسلے میں ایک اہم گزارش بحضورِ علماء و صوفیاء یہ بھی ہے کہ بلاغت کی تعریف آپ کتبِ علم معانی میں یقیناً ملاحظہ فرما چکے ہوں گے جس کی رُو سے مقتضی الحال کے مطابق کلام کرنے کو بلاغت کہتے ہیں اور فنِ مناظرہ کی کتب و رسائل میں یہ امر بھی موجود ہے کہ دورانِ مناظرہ دلیل وہ دی جائے جو مسلّماتِ خصم سے ہو، یعنی فریق مخالف کے نزدیک جو چیز حُجت سمجھی جاتی ہو اِن دو باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دورِ حاضر کے علماء و مشائخ کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ مخالفین و منکرین تصوّف کو ایسے مسکت و مدلّل جواب دیں، جن کی پشت پر کتاب و سنّت کے نا قابل تردید دلائل بھی ہوں اور جنہیں ایک پڑھا لکھا روشن خیال انسان تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے۔ محض یہ کہہ دینا کہ فلاں بزرگ نے یہ لکھا ہے فلاں صوفی یہ کہہ گیا ہے یا ہم کون ہیں بزرگوں کی کتابوں میں کیڑے نکالنے والے؟ یہ کوئی جواب نہیں۔ یہی وجہ ہے آج کا پڑھا لکھا طبقہ تصوّف و اہلِ تصوّف کی باتیں تسلیم کرنے کے بجائے مخالفین کی تحریریں زیادہ ذوق و شوق سے پڑھتا

بھی ہے اور اُنہیں مانتا بھی ہے۔ ماضی قریب کے ایک مشہور و معروف مصنّف غلام احمد پرویز اپنی کتاب ''تصوّف کی حقیقت'' میں نبوّت اور تصوّف کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

''ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ اسلام کی انفرادیّت اور افضلیّت کا مدار ختمِ نبوّت پر ہے اور تصوّف نہایت لطیف انداز سے ختمِ نبوّت کی مُہر توڑ دیتا ہے۔ نبوّت کا مدار مدّعی نبوت کے اِس دعوٰی پر تھا کہ خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے تصوّف کا بھی یہی دعوٰی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ نبی کو عطا ہونے والے علم کا نام وحی ہے اور صوفیاء نے اِس علم کا نام کشف والہام رکھ لیا۔ صاحبِ وحی نے اپنے آپ کو نبی یا رسول کہہ کر پیش کیا، صاحبِ کشف نے اپنے آپ کو صوفی یا ولی کہہ کر پکارا فرق صرف اصطلاحی الفاظ میں ہے، حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے غلطی یہ کی کہ اُس نے اپنے آپ کو نبی مشہور کر دیا اِس لیے اُس کی مخالفت ہوئی، جب تک اُس نے اپنے آپ کو نبی نہیں کہا اُسے صوفی سمجھا جاتا رہا اور نہ صرف یہ کہ کسی نے اُس کی مخالفت نہ کی، بلکہ ہر طرف سے اُس کی تعریف وتوصیف ہوتی رہی''

مزید لکھتے ہیں ''اب آگے بڑھیئے ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوّت ہوتا ہے ختمِ نبوّت کی رُو سے جب انبیاء علیہم السّلام کا آنا ختم ہو گیا تو ظاہر ہے اِس سے معجزہ کا امکان بھی باقی نہ رہا، لیکن تصوّف نے اِس مُہر کو بھی توڑ دیا اور یہ عقیدہ وضع کیا کہ خارق عادات واقعات اب بھی ظہور میں آسکتے ہیں اور آتے ہیں لیکن اُنہیں معجزات نہیں بلکہ کرامات کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ کشف و وحی کے ضمن میں ہوا، ویسے ہی معجزات اور کرامات کے سلسلہ میں کیا گیا۔ کرامات و معجزات میں فرق صرف نام کا ہے حقیقت کا نہیں۔ (ملاحظہ ہو تصوّف کی حقیقت صفحہ 143)

اِسی طرح پرویز صاحب نے اور اُن کے دوسرے، ہم خیال لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ صوفیاء کشف وکرامات کے چور دروازے سے نبوّت ورسالت کی عمارت میں داخل ہوئے۔ اگر وہ نبوّت و رسالت کا دعوٰی کرتے تو مرزا غلام احمد کی طرح اُن کی عالمگیر مخالفت کی جاتی اِس لیے انہوں نے کشف وکرامات کے دروازے کو استعمال کرنے میں آسانی سمجھی۔ اوپر بیان کئے جانے والے مضمون

اور عبارت کو معتقدین صوفیاء محض مخالفین کی ہرزہ سرائی ہی کہیں گے مگر صرف مخالفین پر چار لفظ بھیجنے سے اُن کے اعتراضات زائل نہیں ہو جاتے بلکہ مدّعیانِ نسبت کو قرآن وسنت کے حوالے سے مسکت جواب پیش کرنا ہوں گے اور جن جن زاویوں سے مخالفین نے اعتراض کیے ہیں اُن اُن زاویوں سے اُن کے صرف الزامی جواب ہی نہیں، بلکہ تحقیقی جواب لکھنا ہوں گے۔

میں تو بحمد اللہ تعالیٰ مقبولوں اور فقیروں کا نیاز مند ہوں، اِس کے باوجود بھی مجھے اُن کا مخالف سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ وہ بھی صرف اِس بنا پر کہ میں اکابر اولیاء کے عقائد اور تعلیمات کی تشریح کرتا اور اُن کو اپنانے کی تاکید کرتا ہوں اور اُن کی علمی وجاہت اور دینی خدمات کو اُن کی طرف منسوب کرامات پر ترجیح دیتا ہوں۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کرامت یا کشف کا منکر ہوں۔ البتہ صرف اتنا کہتا ہوں کہ جو صوفیائے سلف کی تعلیمات کو چھوڑ کر محض اُنکی طرف منسوب کشف وکرامات کی داستانوں کو دین کا رُکنِ اعظم اور ایمان کا جُزوِ اہم سمجھتے ہیں وہ میدان میں نکلیں اور صرف تقریری طور پر نہیں بلکہ تحریری طور پر مخالفین کے اعتراضات کا مُسکت اور ٹھوس جواب دیں، بالخصوص غلام احمد پرویز کی کتاب ''تصوّف کی حقیقت'' کو ذرا غور سے پڑھیں اور پارٹی بازی اور تعصب کی عینک اتار کر اُس کے مندرجات اور دلائل کو ملاحظہ کریں اور پھر اُس کے وارد کردہ اعتراضات کا ٹھوس اور مستند جواب بھی تحریر کریں تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ معتقدینِ صوفیاء محض اندھی عقیدت کے مالک نہیں بلکہ علمی زبان میں دلائلِ قطعیہ کے زور سے مخالفین کو دندان شکن جواب دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم اہلِ سنّت، عشاقِ اولیاء تو کہلاتے ہیں اور اُن کے خلاف یا اُن کے مسلک کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کر سکتے لیکن یہ سارا زور اپنوں کی تذلیل پر صرف کیا جاتا ہے اور جو لوگ اِس پورے نظام کو ایک فراڈ، شعبدہ بازی اور دکانداری کا نام دیتے اور اِس کا مذاق اڑاتے ہیں اُن کو مدلّل جواب دیتے وقت اِنہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔

میں نے اپنی رباعیات کی کتاب ''رنگِ نظام'' میں جو مفاہیم بیان کیے وہ میرے نزدیک قرآن وسنّت کی تعلیمات کے مطابق تھے، مگر یار لوگوں نے اُس کے خلاف ایک طوفان برپا کئے

رکھا، مگر میری ایک رباعی کا کوئی مُسکت اور مبنی بر دلائل جواب نہ دے سکے۔ بعض اوقات میں ایسے سوالات کر دیتا ہوں، جو ہمارے ماحول میں ایک کہرام مچا دیتے ہیں، دراصل اُن سوالات سے میرا مقصد صوفیاء کی تذلیل وتحقیر ہرگز نہیں ہوتا، بلکہ مخالفین صوفیاء اور معاندینِ تصوّف کی طرف سے وارد ہو سکنے والے اعتراضات کا خدشہ ہوتا ہے، مگر میرے بعض کرم فرما اِسے میرا ذاتی نقطۂ نظر اور مسلک قرار دیتے ہوئے مجھ پر بے راہ روی کا فتویٰ داغ دیتے ہیں۔ بحمد اللہ میرا دل مطمئن ہے اور میں دین فروش ملاّؤں اور نام نہاد مولویوں کے فتووں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ صرف دکھ یہ ہوتا ہے کہ آج ہمارے اسلاف کو جن زہریلے تیر ہائے تنقید کا ہدف بنایا جا رہا ہے اِس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا صوفیائے سلف ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ اس سارے کیے کرائے کے ذمّہ دار اور جوابدہ ہم اُن کے نام نہاد عقیدت مند ہیں، جو اُن کی مخالفت پر قیامت تو بپا کر دیا کرتے ہیں مگر مخالفین کو کوئی دندان شکن اور مدلّل جواب دے سکنے کی اہلیّت نہیں رکھتے۔ غلام احمد پرویز کے تمام مندرجات سے میں قطعاً متفق نہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اُس کے اُٹھائے ہوئے اکثر ایسے سوالات میری نظر میں ہیں ،جن کا قرآن وسنّت کے حوالے سے مدلّل جواب وقت کی اہم ضرورت اور بزرگانِ دین سے تعلّق وعقیدت کا عین تقاضا ہے۔ لہٰذا میں اولیائے کرام کی تعلیمات وخدمات کے بجائے صرف اُن کے کرامات کو اہمیّت دینے اور ذکر کرنے والے خطباء ومشائخ اور علماء سے گزارش کروں گا کہ خدارا وہ اپنے بہت ہی قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر کم از کم پرویز صاحب کی کتاب ''تصوّف کی حقیقت'' ہی کا قرآن وسنت کی روشنی میں مدلّل جواب کتابی صورت میں اُمّت کے سامنے پیش کریں، کیونکہ اِس کتاب میں تمام سلاسل کے صوفیاء کے کرامات کشف وغیرہ کا خوب آپریشن کیا گیا ہے۔ آج تمام سلاسل کے مشائخ کا یہ فرضِ منصبی بنتا ہے کہ وہ اپنے باکمال اسلاف کے نام پر ملنے والی عزّتوں اور نذر و نیاز پر ہی اکتفا نہ کریں، بلکہ اپنے مخالفین کو یہ بات قرآن وسنّت کے ناقابلِ تردید دلائل و براہین سے ثابت کر کے بتائیں کہ تصوّف محض نبوّت کی عمارت میں بذریعۂ کشف وکرامات نقب زنی کر کے داخل ہونے کا نام نہیں، بلکہ قرآن وسنّت کے مستند حوالوں سے

اس کی حقیقت یوں نہیں، یوں ہے۔ قرآنِ کریم اور اکابر صوفیاء کی تعلیمات کی روشنی میں مسائل و معاملات کو زیرِ بحث لانا کوئی گناہ نہیں۔ میں نے بھی تو سب کی طرح یہی کچھ کیا اور کرتا ہوں، پھر آخر صرف مجھی پر اعتراض کیوں؟ بقولِ شاعر ؎

یہی کہا تھا، مِری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

☆☆☆☆☆☆☆☆

www.faiz-e-nisbat.weebly.com